جناب حبیب سبحانی

شاہ ولی اللہؒ

اور

اُن کا اقتصادی پروگرام

تاریخ انسانی کا سرسری سا جائزہ اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ اقوامِ عالم کی تاریخ فی الحقیقت حق اور باطل طاقتوں کے مابین جنگ و جدل کی تاریخ ہے۔ نیکی و بدی اور خیر و شر کے اسباب و محرکات اور اُن کے غلبہ و اثر کی تاریخ ہے۔ ضعیف الاعتقادی، اوہام پرستی، ذہنی ابتری اور صداقت پسندی، حق پرستی اور روشنیٔ طبع کے تضاد و تصادم کی تاریخ ہے۔ مختلف قبائل و شعوب اور ادنیٰ و اعلیٰ طبقات کے درمیان کشمکش کی تاریخ ہے۔ عالمِ رنگ و بُو کو پہلے سے زیادہ خوبصورت و خوشنما اور پر آسائش بنانے کی طویل اور صبر آزما تاریخ ہے۔ امن و سلامتی اور عدل و انصاف کے عالمگیر اُصولوں کو وسعت و فروغ دینے کی ایمان افروز اور شاندار تاریخ ہے۔ گویا کہ یہ ظلم و زوال اور جبر و استحصال کی طاغوتی طاقتوں کو زیر کرکے بنی نوعِ انسانی کو عطیاتِ ایزدی اور ثمرات آزادی سے بہرہ ور کرنے کی عظیم الشان اور عہد آفریں تاریخ ہے۔

اسلام ایک عالمی انقلابی تحریک کی شکل میں جزیرہ نمائے عرب سے اُبھرا اور اپنے

جذب واثر کی لامحدود قوتوں، اپنے انقلاب پرور افکار و نظریات کی حکمتوں اور اپنے پیغام کی لازوال عظمتوں کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے ۲۵ لاکھ مربع میل کی وسعتوں پر چھاگیا۔ اسلام کی یہ عالمی انقلابی تحریک عمدہ و پختہ اقدار و اطوار، لطیف اور رُوح پرور احساسات و جذبات اور اعلیٰ و ارفع نصب العین کی علمبردار ہونے کے علاوہ مخلص و دیانت دار اور جذبۂ قربانی سے سرشار صاحب ایثار قیادت کی بھی حامل تھی۔ اور اسے تائیدِ ایزدی بھی حاصل تھی۔ اس لیے کامیابی و کامرانی اور فتح و نصرت نے ہر جگہ اور ہر مقام پر اس کے قدم چُومے۔

اسلام کی یہ عالمی انقلابی تحریک گزشتہ ڈیڑھ ہزار برس سے افریقہ اور ایشیا کے گوشہ گوشہ میں سرگرم عمل چلی آرہی ہے۔ اس تحریک نے بیشمار عظیم المرتبت صاحبِ سیف و قلم شخصیات کو جنم دیا ہے، جن میں نامور اور رعایا پرور سلاطین بھی ہیں اور خداپرست و انسان دوست مفکرین بھی، پُرعظمت اور باجبروت بُت شکن فاتحین بھی ہیں اور عالی دماغ و روشن ضمیر مُصلحین بھی، شُہرۂ آفاق اور کامیاب ترین سپہ سالار بھی ہیں اور اور عظیم المرتبت علمائے دین بھی، صاحبِ افکار اور واضح اقدار شعرائے کرام بھی ہیں اور قابلِ صد احترام صوفیائے عظام بھی۔

اسلام کی روشنی کو پھیلانے، ظلم کی سیاہ قوتوں پر غلبہ پانے اور کفر و الحاد کے عفریت سے عوام کو نجات دلانے میں بے تیغ و بے سروسامان صوفیائے کرام کا حصہ ضرب و حرب کے ساز و سامان سے لیس صاحبِ شمشیر مجاہدینِ اسلام سے سوا ہے۔ فرسودہ رسومات کے شکار، طبقاتی تقسیم کی کشمکش میں گرفتار اور اخلاقی برائیوں اور بے عملیوں کے بیمار کروڑوں افرادِ انسانی کو تعصب و تنگ نظری، نفرت و نفاق اور انتشار و خلفشار کے گرداب سے نکال کر راہِ راست پر لانے اور انہیں اسلام کے شاندار افکار و اقدار سے روشناس کرکے انسانی عظمتوں سے ہمکنار کرنے میں سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور ظہیر الدین بابر ایسے باکمال و پُرجلال سلاطین اور عظیم فاتحین کے جنگی کارناموں سے کہیں زیادہ خدمات ان بے تخت و تاج اور بوریہ نشین صوفیائے

کرام نے انجام دی ہیں جنہیں دنیا داتا گنج بخشؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے نام سے جانتی ہے۔ یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے اپنے اپنے دور میں اسلام کی عالمی انقلابی تحریک کی انتہائی شاندار اور باوقار قیادت کی۔ جنھوں نے بے نظیر خلوص و ایثار اور ناقابلِ تسخیر عزم و استقلال سے کام لیتے ہوئے شمع اسلام کو ہر حالت اور ہر صورت میں روشن رکھا ——

—— جنھوں نے اپنے دیدۂ تر سے عقائد کی پھلواری کی آبیاری کی اور خونِ جگر سے شجرِ اسلام کو سینچا۔ ان اربابِ دین و دانش نے قرطاسِ دہر پر ایسے لازوال نقوش چھوڑے جن کو زمانہ کی کوئی گردش، تاریخ کا کوئی جھونکا اور وقت کا کوئی حادثہ کسی طور بھی نہ مٹا سکا۔ یہ شخصیات تاریخ کے اوراق اور اسلام کے آفاق پر آج بھی مہر و ماہتاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہیں اور ان کے عظیم کارنامے خلوص و ایثار اور عزم و عمل کا ایمان افروز اور انقلاب آفرین پیغام بن کر ہمیشہ صفحۂ ہستی پر جلوہ گر رہیں گے۔

برّصغیر پاک و ہند کی ان عظیم المرتبت رُوحانی شخصیات میں شاہ ولی اللہؒ ایک منفرد و ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے جس دَور میں جنم لیا وہ اسلامیانِ برصغیر کی تاریخ کا انتہائی نازک اور کٹھن دَور تھا۔ انھوں نے ایک ناسور زدہ معاشرہ میں آنکھیں کھولی تھیں۔ ایک زوال آمادہ تہذیب میں پرورش پائی تھی اور انھیں ایک زخم خوردہ قوم ورثہ میں ملی تھی۔ ان کی پیدائش سے چند برس ہی پیشتر ہندوستان کی دیوارِ عظمت میں ایک ایسا شگاف پڑگیا تھا جس کے نتیجہ میں بالآخر مغل سلطنت کی سالمیت پارہ پارہ ہوکر رہ گئی اور ملک کا امن و امان درہم برہم ہوگیا۔

ابھی انھوں نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ قوت و عظمت کا وہ حصار مسمار ہوگیا جس نے اہلِ ہندوستان کو ہر نوع کے اندرونی و بیرونی خطرات و خدشات سے محفوظ و مامون رکھا تھا۔ ابھی وہ سنِ بلوغت کو بھی نہ پہنچ پائے تھے کہ لطف و کرم اور رحمت کا وہ سایہ اٹھ گیا جس نے کروڑوں افرادِ انسانی کو امن و عافیت اور عزّت و

آبرو کی زندگی کے اسباب مہیا کر رکھے تھے ۔ ابھی ان کے فکر وشعور نے آنکھیں بھی نہ کھولی تھیں کہ دبدبہ وجلال اور جرأت و ایثار کا وہ سورج غروب ہوگیا جس کی حرارت وروشنی میں تمام شرپسند عناصر حشرات الارض کی مانند زیرِ زمین پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے تھے ۔ ہندوستان کی وہ دیوارِ عظمت ، قوت وعظمت کا وہ حصار ، لطف وکرم اور رحمت کا وہ سایہ اور دبدبہ وجلال اور جرأت وایثار کا وہ سورج محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ تھا ۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ مضبوط دل ودماغ کا مالک ، پاکیزہ افکار و اقدار کا حامل اور ایک بااُصول ، خُدا ترس اور روشن ضمیر حکمران ہونے کے علاوہ ایک مردِ شمشیر زن بھی تھا ۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہا نہ تو فتنے جنم لے سکے اور نہ باغی سر اُٹھا سکے ۔ جن انتہا پسند فرقہ پرست قوتوں نے سر اٹھایا اور جن متشدّد ومتعصّب اور ظالم طاقتوں نے پر پُرزے نکالے اورنگ زیب کے بازوئے صف شکن نے انہیں کچل کر رکھ دیا لیکن اورنگ زیب کے اس دارِ فانی سے رخصت ہوتے ہی یکے بعد دیگرے فتنے سر اٹھانے لگے ۔ معاشرتی برائیاں کھل کر سامنے آنے لگیں اور منفی قوتیں اپنا اثر دکھانے لگیں ۔ امرائے سلطنت ہوس اقتدار میں اندھے ہوکر سازشیں کرنے لگے ۔ صوبے داروں نے مرکز سے بغاوت کرکے آزاد ریاستیں قائم کرلیں ۔ دکن اور اودھ ایسے اہم علاقے کٹ کر علٰحدہ ہوگئے ۔ غیر مسلموں نے جب مسلمانوں کو آپس میں یوں دست وگریباں دیکھا تو وہ نہ صرف مغل سلطنت کے خلاف صف آراء ہوگئے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو من حیث القوم ہر جگہ اور ہر مقام پر ظلم وستم کا نشانہ بنانا شروع کردیا ۔ مرہٹوں نے علم بغاوت بلند کرکے مالوہ ، گجرات اور اڑیسہ پر اپنی حکومت قائم کرلی ۔

ادھر پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک مستقل اور زبردست محاذ کھول کر لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کردیا ۔ روہیلوں اور جاٹوں نے الگ سرکشی اختیار کرکے ملک کو شورشوں اور ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنادیا ۔

جب کسی قوم و ملک کے حالات و واقعات انتہائی پریشان کن اور دگرگوں ہو جاتے ہیں، جب صداقت پر جھوٹ، راستبازی پر ریاکاری، خلوص پر خودغرضی اور انصاف پر ظلم غالب آجاتا ہے، جب ہمت و جرأت اور عزم واستقلال کی جگہ تن آسانی، تساہل پسندی اور بزدلی لے لیتی ہے، جب علم و حکمت اور روشن ضمیری کی جگہ تعصب و تنگ نظری کا پہرہ بیٹھ جاتا ہے، جب شرم و حیا، خود داری اور عزتِ نفس کی جگہ بے شرمی و بے حیائی، ضمیر فروشی اور خود فراموشی کا دَور دورہ ہو جاتا ہے، جب عزم و عمل کی قوتیں ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور ناکامی و نامرادی کے سائے پھیل جاتے ہیں۔ جب قوم فروشی اور وطن دشمنی کی وبا عام ہو جاتی ہے، جب صبر و تحمل، اخلاق و بردباری اور شجاعت و مردانگی کی جگہ آوارہ خیالی، تلوّن مزاجی اور پست ہمتی لے لیتی ہے، جب قوم کا ہر فرد خودغرضی، بے اُصولی اور مفاد پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور جب ملک کے گوشہ گوشہ میں بدنظمی و انتشار پھیل جاتا ہے اور عوام پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے تو پھر فطرت کا روزِ ازل سے یہ اصول رہا ہے کہ ایسے حالات میں رحمتِ الٰہی جوش میں آجاتی ہے اور خداتعالیٰ اپنے مظلوم و محکوم اور راہِ راست سے بھٹکے ہوئے بندگان کی فلاح و اصلاح کے لیے کوئی ایسا مردِ دانا پیدا کر دیتا ہے جو گمراہ انسانیت کی راہ نمائی کرتا ہے۔ اس ضمن میں خود شاہ ولی اللہؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں یوں رقمطراز ہیں:-

"انسانیت پر جب ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ بنی نوعِ انسان کو اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرتِ الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کو ناجائز حکومت کے بوجھ سے آزاد کر دے۔ چنانچہ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں نے یہی وطیرہ (آرام و آسائش۔ رفاہیتِ بالغہ) اختیار کر رکھا تھا۔ اس مرض کے ازالہ کے لیے اُمیّین (عربوں) میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا گیا - فرعون کی ہلاکت اور قیصر و کسریٰ کی تباہی اس اصول پر لوازمِ نبوت میں شمار ہوتی ہے "

اللہ تعالیٰ پہلے زمانوں میں افرادِ انسانی کی راہنمائی کے لیے انبیائے کرام کو مبعوث کیا کرتا تھا - محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر انبیاء کی بعثت کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انبیائے عظام کی جگہ اپنے دیگر مقربانِ خاص یعنی اولیائے کرام کے ذریعہ رشد و ہدایت کے سلسلہ کو جاری رکھا - اس طرح یہ دعوٰی بجا طور پر کیا جاسکتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کے علاوہ فرستادۂ خدائے بزرگ و برتر بھی تھے - اور جس طرح سردارِ انبیاء، خیر البشر اور ختم الرسل محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام بنی نوعِ انسان کی مستقل فلاح و اصلاح کے علاوہ اس دور کی برائیوں کا خاتمہ اور قیصر و کسریٰ کی ظلم و زیادتیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بھیجا گیا یعنی ایک طرف تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب و سنت کے ذریعہ تمام بنی نوعِ انسان کی ابد الآباد تک کے لیے قیادت و راہنمائی کا اہم اور بنیادی فریضہ سرانجام دیا اور دوسری طرف اپنے دَور کی مخصوص برائیوں کا بھی قلع قمع کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہؒ کو انبیاء علیہم السلام کے بلند و بالا منصب و مقام سے قطع نظر دوسری سطح پر اصلاحِ احوال اور فلاح انسانی کے لیے بھیجا۔ اس ضمن میں شاہ صاحب خود اپنے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ وہ علم و حکمت کے دَورِ حاضر کے امام ہیں -

شاہ صاحب کے زمانے میں مغل فرمارواؤں سمیت ہندوستان کے چھوٹے بڑے تمام حکمرانوں اور امرائے سلطنت کی حالت و حیثیت قیصر و کسریٰ جیسی ہوچکی تھی۔ اور افرادِ انسانی کی معاشی و اخلاقی حالتِ زار کسی طور دورِ جاہلیت سے بہتر نہ تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمان مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے ذلّت و پستی کے غاروں میں گر چکے تھے - سیاسی اور اقتصادی افراتفری اور ذہنی اور فکری ابتری کا دَور دورہ تھا - جن ذمہ دار افراد کو حکومت کا نظم و نسق

چلانا تھا وہی حکومت کی تخریب و تباہی کا سبب بن چکے تھے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر عوام ظلم و ستم اور جبر و استحصال کی چکّی میں پس رہے تھے اور چیرہ دست امراء کے ظلم و تشدد کا نشانہ بن رہے تھے۔ رشوت ستانی، اقربا پروری، لوٹ کھسوٹ اور طوائف الملوکی عام ہو چکی تھی۔

اسلام کی تعلیم و تدریس اور اشاعت و تبلیغ کی ذمہ داری دو طبقوں پر عائد ہوتی تھی، ایک علماء جو مذہب کے ظاہری رسوم اور عام عقائد کے محافظ و نگہبان تھے اور دوسرے صوفیاء جو اسلام کی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علمبردار ہونے کے دعویدار تھے۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک اندوہ ناک المیہ ہے کہ علماء کتاب اللہ کی تاویلات میں ایسے اُلجھے کہ بس الجھ کر ہی رہ گئے۔ بحث و تحمیص کی بوچھاڑ اور اُمور و مسائل کی اکھاڑ پچھاڑ نے اسلام کی صداقتوں کو بندگانِ خدا کی آنکھوں سے اوجھل اور عوام کی زندگی کو فرسودہ رسومات کی بھرمار سے بوجھل کر دیا تھا۔

اس ضمن میں نام نہاد صوفیاء بھی قریب قریب وہی کردار انجام دے رہے تھے جو کردار ملاؤں کا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن علماء اور صوفیاء کو احکاماتِ الٰہی اور اُمورِ دینی کے باب میں قیادت و راہنمائی کا فریضہ انجام دینا چاہیے تھا، جنھیں نبّاضِ ملّت کی حیثیت سے جدید و قدیم امراض کی تشخیص کرنا تھی اور ملّتِ بیمار کی صحت کے لیے دوا تجویز کرنا تھی بدقسمتی سے وہی علماء اور صوفیاء بذاتِ خود بہت سے امراض کا سبب بن گئے۔ اور انھوں نے اپنی جہالت، خود غرضی اور مفاد پرستی کے سبب اسلام کو اسرائیلی اساطیر، عجمی افکار اور ہندوانہ رسومات کا ایک ایسا لباس پہنا دیا کہ اسلام کے پیرو کار بھی اسلام کے اصل اور صحیح خدّ و خال نہ دیکھ پائے تھے غرض یہ کہ اسلام کی اشاعت کے دعویدار اور عظمتِ اسلام کے علمبردار دونوں گروہ ذلّت و پستی کے گرداب میں پھنس کر بندگانِ خدا کو گمراہ کر رہے تھے۔ یہ نام نہاد علماء اور برائے نام صوفیاء، اسلام کی روح سے بیگانہ، عصری تقاضوں سے ناآشنا اور مسلمانوں کی عملی زندگی کی ضروریات سے قطعی بے خبر تھے۔ ان کا ذہن کسی طور اس

حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کہ دین کے اصولوں کی روشنی میں عملی زندگی کی مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے اور ہر نوع کے دنیاوی اُمور و مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے اور علماء و صوفیاء اس کارنامہ میں اہم اور بنیادی کردار ادا کرسکتے ہیں۔

یہ تھے وہ دل خراش و روح فرسا اور ناقابل برداشت حالات و واقعات، جن کے پیش نظر شاہ ولی اللہؒ نے غلام و محکوم اور مظلوم و محروم افرادِ انسانی کی فلاح و بہبود اور نجات و رہائی کے لیے اپنا اقتصادی پروگرام پیش کیا۔

شاہ ولی اللہؒ محض ایک عالم دین ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک صاحب افکار فلسفی بھی تھے۔ وہ ایک حساس اور درد مند دل کے حامل اور زندہ و بیدار ذہن کے مالک بھی تھے۔ اُنھوں نے کتاب و سنت، اور مروّجہ علوم کا بغور مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامیان عالم کی بالعموم اور اسلامیان برصغیر کی بالخصوص دگرگوں اور ناقابلِ بیان حالتِ زار کا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں مغل سلطنت کے زوال و انحطاط اور معاشرہ کی تخریب و تباہی کے اسباب و محرکات کا بھرپور تجزیہ بھی کیا۔ درپیش اندرونی مصائب و مسائل اور بیرونی خطرات و خدشات نے شاہ صاحب کے ذہنِ بیدار اور قلبِ حساس میں درد و کرب کا ایک طوفان برپا کردیا۔ ان کے فکرِ رسا نے جلد ہی موجودہ خدشات اور آئندہ خطرات کا مکمل طور پر احاطہ کر کے ان کے تمام تر اثرات و مضمرات کا اندازہ کرلیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ظلم کی سیاہ قوتوں پر غلبہ پانے اور حق و انصاف کے اصولوں کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی تحریک کا آغاز کیا۔

ملک و قوم کے حالات و واقعات نے شاہ صاحب پر اس حقیقت کو روشن کردیا تھا کہ مسلمانوں کی شکست و ذلّت، اور تخریب و تباہی کا اصل سبب وہ غیر منصفانہ اور ظالم معاشی نظام تھا جس کے دردناک عذاب میں عوام مبتلا تھے۔ چنانچہ جبر و استحصال کے اُس ظالم معاشی نظام کا خاتمہ کرنے کے لیے شاہ ولی اللہؒ سراپا شعلۂ افکار بن کر لپکے۔ اُنھوں نے اپنی قوم کے زخموں معاشرہ کے ناسوروں اور تہذیب کے بدنما داغوں

کا تجزیہ کیا۔ وہ اس دل خراش اور تکلیف دہ حقیقت سے بھی پوری طرح واقف و آگاہ تھے کہ اسلامیانِ برصغیر کی معاشی بدحالی ان کے اخلاقی انحطاط اور سیاسی زوال کی بنیادی وجہ قرآنی احکامات سے بے خبری اور اسلامی اصولوں سے ناواقفیت تھی جس کی بنا پر عوام اسلام کی راہ سے ہٹ کر عجمی افکار و تصورات اور ہندوانہ اقدار و رسومات کا شکار ہو چکے تھے۔

ان تلخ اور دل آزار حالات کے پیش نظر شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے مسلمانوں کو قرآن سے رُوشناس کرانے کے لیے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اُسے "فتح الرحمٰن" کا نام دیا۔ قرآن کا ترجمہ اور مقدمہ لکھنے کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے قرآن حکیم پر حواشی بھی تحریر کیے۔ جن میں انہوں نے اپنی آراء بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اقتصادی پروگرام کے اہم نکات بھی شامل کر دیئے۔ انھوں نے قرآن کی تفسیر کے اصول بھی مدوّن کیے جس کے لیے انھوں نے " الفوزُالکبیر فی اُصُولِ التفسیر" الگ کتاب تصنیف کی اور "فتح الخبیر" کے عنوان کے تحت قرآن کے مشکل الفاظ کی تشریح کر کے اسے "الفوز الکبیر" کا حصہ بنا دیا۔ شاہ صاحبؒ کی ان گراں قدر تصانیف نے قرآنی تعلیمات کو عام فہم اور آسان بنا دیا۔

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مفکرانہ نگارشات "مکتوبات" اور "خطبات" کے ذریعہ اس تاریخی حقیقت کو ایک مرتبہ پھر ظاہر و ثابت کر دیا کہ اسلام محض مذہبی معتقدات ثقافتی رسومات، مخصوص تقریبات اور مجموعۂ عبادات کا نام نہیں بلکہ اسلام درحقیقت ایک ایسے سائنٹیفک نظریاتی نظام کا نام ہے جس سے روشنی اور راہنمائی حاصل کر کے ایسے کارگر و کارآمد نظامہائے سیاست اور ترقی پسند و سود مند دستورہائے معیشت وضع کیے جا سکتے ہیں جن کو نافذ العمل کر کے عصری تقاضوں کی مناسب اور بروقت پذیرائی بھی ممکن ہے اور جس سے ہر دَور، ہر ملک، اور ہر قوم کے ہر نوع کے مسائل کے حل بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ زندگی کی ہر جہت میں تعمیر و ترقی بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور کائنات کے رازہائے سربستہ سے پردے بھی اٹھائے جا سکتے ہیں۔ غرض یہ

اسلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر مادی عظمتوں کو بھی پایا جا سکتا ہے اور روحانی رفعتوں کو بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کا یہ پختہ یقین تھا کہ قرآن حکیم عالمگیر اور آفاقی اُصولوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے مشعلِ راہ قرار دیکر ہر ملک و قوم اور ہر دور کے باشندے فوزِ عظیم حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اس امر پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ابدالآباد تک جب بھی کوئی جماعت اسلام کے نظریاتی نظام کو نافذ کرے گی تو اس سے ہمیشہ اور ہر مقام پر وہی نتائج برآمد ہوں گے جو تاریخ اسلام کے دور اول یعنی خلفائے راشدین کے زمانہ میں برآمد ہوئے تھے۔

شاہ صاحبؒ کا شمار ان عظیم المرتبت مذہبی ملّی اور روحانی شخصیات میں ہوتا ہے جنھیں خدائے بزرگ و برتر نے ایک قلب حساس اور خردِ حکیمانہ عطا کی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ ایسی فوق العادت قابلیت کے مالک غیر معمولی فہم و فراست کے حامل، متبحر عالمِ دین، صاحب افکار اور ماہرِ اقتصادیات اور نابغۂ روزگار افراد صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے علمی اور ادبی کمالات، مفکرانہ نگارشات، عالمانہ خیالات اور حکیمانہ نظریات ایک ایسا عطیہ عظیم ہیں جن سے ہمارے قومی ولولوں اور ملّی عزائم کو ہمیشہ تقویت و تازگی ملتی رہے گی۔ گو انھیں وفات پائے کم و بیش دو صدی کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن ان کی مفکرانہ نگارشات اور انقلابی نظریات میں آج بھی وہی شگفتگی اور تازگی پائی جاتی ہے۔ اور ان کے عہد آفریں پیغام میں آج بھی جذب و اثر کی وہی قوت اور احساس و وجدان کی وہی شدت موجود ہے جس نے برسوں پیشتر ملّت اسلامیہ کے دلوں کو گرمایا اور رُوح کو تڑپا دیا تھا۔

یہ فکر ولی اللّٰہی کی کرشمہ سازی تھی کہ حسرت و یاس، خوف و ہراس اور غربت و افلاس کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کی کرنیں ہی نہیں پھوٹیں بلکہ ایمان و ایقان، ہمت و جرأت اور افکار و انوار کے ایسے چراغ روشن ہوگئے جن کی ضَو فشانیوں اور نُور

پاشیوں نے ایک نئے جہانِ فکر کو جنم دیا۔ جس کی بدولت ایک نئے اندازِ تحریر نے آنکھیں کھولیں، ایک نیا طرزِ استدلال پیدا ہوا، ایک نئے اسلوب بیان نے پرورش پائی، ایک نئے طریقِ تخاطب نے سر اٹھایا، ایک نئی قیادت نے انگڑائی لی، ایک نئی جماعت کی صف بندی ہوئی اور ایک انقلابی تحریک پروان چڑھنے لگی۔ سوزِ عشق جاگ اٹھا اور اسلام کے سرمدی نغمے فضاؤں میں گونجنے لگے۔

ہندوستان تبلیغ اسلام کے تین ادوار سے گزرا ہے۔ دورِ اول کے نمایاں ترین شخصیات، حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت معین الدین اجمیریؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہیں۔ دوسرے دور کے قائد اور رہنما حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ ہیں۔ جب کہ تیسرے اور آخری دور کے نقیب، فلسفی اور امام شاہ ولی اللہؒ ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر نے شاہ صاحبؒ پر یہ امر روشن کر دیا تھا کہ انسانیت کا سب سے اعلیٰ و ارفع اور با مقصد و جامع فکر اسلام کا نظریاتی نظام ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ اسلام تمام اَدیان کا نچوڑ اور قرآن تمام الہامی صحیفوں کا ماحصل ہے۔ اسلام کے اصولوں کے مطابق جہاد افضل ترین عمل ہے اور فلاحِ انسانی منشائے ایزدی ہے۔

اِن تمام حقیقتوں کو جان لینے کے بعد شاہ صاحب نے تمام مذاہب و ادیان اور تمام نظامہائے اخلاق کے مشترک مبادی متعین کیے۔ اس طرح مسلمانوں اور دیگر افرادِ انسانی کے سامنے اُن تمام ذہنی و فکری وسعتوں کو پھیلا دیا، قرونِ اولیٰ کے مسلمان جن کو اسلام کی روح قرار دیتے تھے۔ شاہ صاحبؒ کے خیال کے مطابق دُنیا کے تمام حق پرست اور حقیقت شناس افراد حقیقت کو ہمیشہ اور ہر مقام پر ایک ہی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ قطع نظر اس اَمر کے کہ وہ جن الفاظ و اصطلاحات میں اپنے مشاہدات و تجربات بیان کرتے ہیں اور جس طور اور جس انداز سے حقیقت کی تشریح و توضیح کرتے ہیں وہ اپنے مخصوص زمانہ، مزاج اور ماحول کے اعتبار سے ایک

دوسرے سے قدرے مختلف اور جُدا ہوتی ہے۔ کم فہم اور کج خیال افراد اس تشریح اور ان الفاظ ہی کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ انسانی اخلاقیات دراصل ان عالمگیر حقیقتوں کا نام ہے جن سے افرادِ انسانی صدیوں سے آشنا چلے آرہے ہیں۔ نیکی اور بدی کی قوتیں کوئی ایسی پنہاں قوتیں نہیں جن کی تلاش و دریافت میں کسی خاص تگ و دو کی ضرورت محسوس ہو۔ وہ تو ذہنِ انسانی کی مدتوں سے جانی پہچانی اشیاء ہیں۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے کہ قرآنِ کریم نے نیکی کو مَعْرُوف اور بدی کو مُنکَر کہہ کر پیش کیا ہے یعنی نیکی وہ شئے ہے جسے سب اچھا جانتے ہوں اور مُنکَر وہ شئے ہے جسے سب بُرا سمجھتے ہوں۔ اسے قرآن میں یوں بھی بیان کیا گیا ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ۝

"یعنی نفسِ انسان کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔"

قرآن جامعُ الاُمَم ہے۔ وہ کسی ایک گروہ، قوم یا جماعت کی تاریخ بیان نہیں کرتا کسی ایک فرد یا افراد کے کسی مخصوص خاندان یا قبیلے کے لیے احکامات صادر نہیں کرتا۔ ہرچند کہ قرآن میں زیادہ تر ذکر بنی اسرائیل کے انبیاء کا ہے لیکن یہ تو صرف مصلحت اور وقت کا تقاضا تھا۔

فکرِ انسانی محدود نہیں بلکہ عالمگیر ہوتا ہے لیکن عوام کو اس سے روشناس کرانے کے لیے خاص الفاظ اور حروف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ذرا امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل نوعِ انسانی قرآنِ حکیم میں اپنا مافی الضمیر اور مقصد پا سکتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مفکرانہ نگارشات میں جا بجا قرآن کے اس ہمہ گیر پہلو کو نمایاں کیا اور اپنے زورِ بیان، شدتِ احساس اور عظمتِ افکار کے ذریعہ مسلمانوں کے خوابیدہ ذہن و ضمیر کو بیدار کر کے ملّتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔

شاہ صاحبؒ کی مفکرانہ نگارشات کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ قرآنِ حکیم عالمگیر و آفاقی افکار و نظریات اور اوامر و نواہی کا ایک

ایسا دلکش مرقع ہے ، اور اسلام کا نظریاتی نظام عالمی انقلابی اقدار کا حامل ایک ایسا مثبت اور فلاحی لائحۂ عمل ہے جو بنی نوعِ انسان کی روشنی و راہنمائی کے لیے مستقل اور موثر بالذات حکمتِ عملی پیش کرتا ہے۔ اس کے نفاذ کے لیے کسی خاص ملک اور زبان یا کسی خاص دور اور قوم کی قید اور پابندی نہیں ، ہر قوم کے افراد اسلام کے نظریاتی نظام پر عمل پیرا ہوکر معاشرہ میں انقلاب برپا کرسکتے ہیں۔ کتاب وسنت کے اُصولوں کو اپنا کر ہر دَور اور ہر زمانہ میں فوزِ عظیم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے خیال کے مطابق طبقاتی کشمکش ، اقتصادی جبر واستحصال اور معاشی ناہمواریاں کسی قوم یا معاشرہ کی خرابی اور تباہی کا سب سے بڑا سبب اور اصل وجہ ہوا کرتی ہیں۔ غیر متوازن اور غیر منصفانہ معاشی نظام ظلم وزیادتی ، انتشار وخلفشار اور جبر واستحصال کو جنم دینے کے علاوہ اخلاقی اور روحانی تنزل بھی پیدا کرتا ہے۔ معاشرہ کی ان تمام بیماریوں اور برائیوں کے علاج وانسداد کے لیے قرآن حکیم انقلاب کا نسخہ تجویز کرتا ہے۔

انقلاب کا لانا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ ہر نوع کی ناانصافیوں ، نارسائیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ کرکے معاشرہ میں مطلوبہ توازن پیدا کردیا جائے۔ معاشرہ کے ہر فرد کو جان و مال اور عزت وآبرو کا تحفظ دے کر اس کی معاشی ضروریات کو پورا کیا جائے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر گامزن ہوکر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے جو افرادِ انسانی کے جان ومال اور عزت وآبرو کا محافظ اور ان کی خوشحالی اور فارغ البالی کا ضامن ہو ، جو قوت وعظمت اور شان وشوکت کا مسکن اور علم وادب اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہو۔

شاہ ولی اللہؒ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جو ہر نوع کی ظلم وزیادتی اور جبر واستحصال سے پاک وصاف ہو۔ جہاں اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی ہو ، جہاں خلوص وایثار کا دَور دورہ اور انسان دوستی کی حکمرانی ہو ، جہاں افرادِ انسانی کو تعمیر وترقی ، تعلیم وتعلم ، حفظانِ صحت اور حصولِ روزگار کے مساوی اور

یکساں مواقع فراہم ہوں، جہاں فرد، حکومت اور اجتماع کے مابین تمام رشتوں اور رابطوں کا تعین عدل وانصاف کے عالمگیر اور آفاقی اصولوں کے مطابق کیا جائے۔اس اعلیٰ وارفع نصب العین کے حصول کی خاطر شاہ صاحبؒ مسلمانوں کی ایک ایسی مضبوط، طاقتور اور قدآور جماعت کی صف بندی کرنا چاہتے تھے جو اُس دَور کے رجعت پسندانہ نظام کو توڑ کر کتاب وسنت کے پیش کردہ نظریاتی نظام کو نافذالعمل کرے، معاشی مساوات کو قائم کرنے کے لیے وہ ایک ایسے سیاسی نظام کو نافذ کرنے کے خواہشمند تھے جس کی بنیادیں فلاحِ انسانی اور اصلاح معاشرہ کے عالمگیر اسلامی اُصولوں پر استوار کی گئی ہوں اور حکومت محض عوام پر حکم چلانے یا ٹیکس وصول کرنے کے لیے قائم نہ کی گئی ہو بلکہ اس کے قیام کا اصل مقصد خدمتِ خلق اور انسان دوستی کے ذریعہ عوام کو آرام وآسائش پہنچانا اور ان کی زندگی کو پہلے سے بہتر وخوشنما بنانا ہو۔

امام الہند شاہ ولی اللہؒ رفاہی مملکت کی حکومت کے قیام کے بارے میں جو موقف رکھتے تھے وہ یہ تھا کہ ایک ایسی حکومت تشکیل دی جائے جہاں انصاف پروری اور عدل گستری کرنے والا خواہ امیر کی حیثیت سے فرد واحد ہو یا یہ فرائض انجام دینے والی کوئی ایسی مجلس ہو جو پوری قوم کی نمائندگی کرتی ہو۔ امام الہندؒ کے اس نظریہ سے جمہوری طرزِ حکومت کی شکل وصورت برآمد ہوتی ہے۔ اپنے اقتصادی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امام الہندؒ ایک مضبوط ومستحکم نظام حکومت کے علاوہ ایک آزاد اور باوقار عدلیہ کے نظام کو بھی لازمی خیال کرتے تھے۔ مزید برآں وہ اندرونی وبیرونی خطرات وخدشات سے افرادِ انسانی کے جان ومال اور عزت وآبرو کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک کارآمد وکارگر اور مضبوط وموثر عسکری نظام کے قیام کو بھی اپنے اقتصادی پروگرام کا ایک اہم حصہ قرار دیتے تھے۔

یہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ وہ اپنے اقتصادی پروگرام پر عمل درآمد کرانے کے لیے انتظامیہ کے عہدوں پر ایسے ذمہ دار، فرض شناس اور دیانت دار افراد کا تقرر چاہتے تھے جن میں شاہ صاحبؒ کے پیش کردہ اصولوں کو نافذالعمل کرنے کی پوری

پوری صلاحیت اور قابلیت موجود ہو۔ جو نہ تو اپنے فرائض سے غفلت و اغماض برتیں اور نہ اپنے مفوضہ اختیارات سے تجاوز ہی کرتے ہوں۔

شاہ صاحبؒ کے خیال کے مطابق کتاب وسنت کو مرکز ومحور بنا کر اور خلافتِ راشدہ کو مشعلِ راہ قرار دیکر ایک ایسی مضبوط و مستحکم اور رفاہی و فلاحی مملکت کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے جو اپنی آئینی عمدگیوں، معاشی ضمانتوں، سیاسی آزادیوں، تخلیقی صلاحیتوں اور انقلابی قوتوں کی بدولت ملک و قوم کو اخلاقی رفعتوں، تہذیبی آسودگیوں، ثقافتی آسائشوں اور روحانی مسرتوں کا گہوارہ بنادے۔ ایسی حکومت صرف عالم اسلام ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کے لیے مثالی فلاحی مملکت کا بہترین نمونہ ثابت ہوگی۔

امام الہند شاہ ولی اللہؒ پر یہ امر روشن ہوچکا تھا کہ شہنشاہیت کا دَور ختم ہوچکا ہے اور اب آئندہ حکومت کی اساس کچھ اور ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے جس ذہنی وفکری تحریک کا آغاز کیا وہ عوام کے معاشی اور سیاسی حقوق کی محافظ و نگہبان ہونے کے علاوہ ایک عالمگیر اور آفاقی تحریک تھی۔ اُن کے پیشِ نظر پُورا ملک اور تمام افرادِ انسانی تھے۔ چونکہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور علاوہ ازیں امام الہندؒ اسلام کے نظریاتی نظام کو دنیا کے دیگر تمام مذاہب کے پیش کردہ معاشرتی نظاموں اور مختلف النوع سیاسی و معاشی مکاتیبِ فکر کے وضع کردہ دستورہائے معیشت سے ہر اعتبار سے افضل و برتر، مکمل وجامع، بامقصد و ترقی پسند عام فہم اور قابلِ عمل ہونے کے علاوہ عوام کے لیے قابلِ قبول بھی سمجھتے تھے۔

بنا بریں اُنھوں نے اسلامیانِ برِصغیر کو مخاطب کیا اور اہل ہندوستان کی فلاح و نجات کے لیے جو سیاسی نظام اور معاشی دستور پیش کیا وہ کتاب وسنت کے رہنما اُصولوں پر مبنی تھا۔

کتاب وسنت کو سیاست و معیشت کی اساس قرار دے کر شاہ صاحبؒ نے اس امر پر زور دیا کہ قرآن کا مقصد ہر دور اور ہر قوم میں انقلاب برپا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے پیرو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اخلاق

و آداب کے اسلامی سانچوں میں ڈھالیں اور براہِ راست کتاب و سنت سے روشنی حاصل کریں۔ اس طرح مسلمانوں کو جو راستہ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے کتاب اللہ سے رجوع کریں اور اپنے تمام تر اُمور و مسائل قرآنی اصولوں کے مطابق حل کریں۔ اگر کسی مسئلہ کے بارے میں قرآنِ حکیم میں واضح ہدایات موجود نہ ہوں تو اس مسئلہ کا حل احادیثِ نبویؐ سے تلاش کیا جائے۔ اگر کسی مسئلہ میں احادیث بھی خاموش ہوں تو اس صورت میں خلفائے راشدین کے اقوال و کردار کو مشعلِ راہ قرار دیا جائے اور اگر کسی مسئلہ کے بارے میں ان مستند ذرائع سے براہِ راست روشنی حاصل نہ ہو سکے تو پھر قوم کے ذمّہ دار صاحبِ علم اور روشن ضمیر افراد کتاب و سنت کے پیش کردہ راہنما اصولوں کی روشنی میں اپنے مخصوص حالات و واقعات کے پیشِ نظر کوئی مناسب و موثر حل خود تلاش کریں۔

امام الہندؒ کا نصب العین ہر ناپختہ خیال کو پختہ، ہر شکستہ شئے کو ثابت، ہر ابتر حالت کو بہتر، ہر نا مکمل منصوبہ کو مکمل، ہر ناخواندہ ذہن کو خواندہ، ہر ناستودہ نظریہ کو ستودہ، ہر ناآسودہ ضمیر کو آسودہ اور ہر فرسودہ نظام کو اعلیٰ و ارفع بنانا ہے۔ اپنے انقلابی نظریہ کو شاہ صاحبؒ نے "فَكُّ كُلِّ نِظَامٍ" یعنی ہر بوسیدہ نظام کی بربادی کے عنوان میں بیان کیا ہے۔

دنیا پر جب انسان نے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور اُسے ابتدائی طور پر جو ضروریات اور مشکلات پیش آئیں وہ کم و بیش حیوانات کی ضروریات اور مشکلات سے مشابہ تھیں۔ لیکن انسان اور حیوان میں واضح طور پر فرق و امتیاز موجود ہے۔ ہر دو میں فہم و ادراک تلاشِ معاش اور حصولِ مقصد کے باب میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ انسان غور و فکر کر سکتا ہے اور اپنے احساسات و خیالات کو تحریر و تقریر کے سانچوں میں ڈھال سکتا ہے۔ وہ عقل و دانش اور فہم و فراست کو بروئے کار لاکر رفاہِ عامّہ کے کام کر سکتا ہے اور ان تمام امور کی انجام دہی میں حسنِ لطافت اور ذوقِ جمال کو پیشِ نظر رکھ سکتا ہے۔ اُس میں تہذیب و تمدن کا شعور، ایجاد و اختراع کی قدرت اور تسخیرِ کائنات کا ملکہ موجود

ہے۔ امام الہندؒ انسان کی معاشی زندگی کو ارتفاقات کے چار درجوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق انسان اپنی معاشی زندگی کی چار منازل سے گزر کر ہی نشوونما اور ارتقاء حاصل کرسکتا ہے۔ ان منازل کو بیان کرتے وقت شاہ صاحبؒ نے خوراک، پانی، لباس، مکان، حفظانِ صحت اور حصولِ علم کے ذرائع واسباب کو افرادِ انسانی کی طبعی ضروریات قرار دیا ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ ان بنیادی ضروریات کے حصول کے بعد ہی کوئی اجتماع ترقی کر کے ارتفاقِ دوم میں داخل ہوسکتا ہے۔ بنیادی معاشی ضروریات کی تکمیل کے بعد انسان اجتماعی زندگی کی فلاح و اصلاح کے بارے میں غور و فکر اور تجربات کرسکتا ہے۔ اور ارتفاقِ دوم کے معاملات کو عمدہ اور بہتر طور پر سرانجام دینے کے علاوہ اجتماعی زندگی کے اُمور و مسائل کو صحت و صفائی اور کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

یہی وہ واحد راستہ ہے جس سے انسان حیوانی سطح سے بلند ہو کر نیک و بد، خیر و شر اور خوب و ناخوب میں فرق و امتیاز کرسکتا ہے اور بتدریج ترقی کر کے اعلیٰ مدارج حاصل کرسکتا ہے۔ حیاتِ انسانی کے اس تاریخی عمل کو ارتفاقِ دوم کا نام دیا ہے اور اس کے مندرجہ ذیل پانچ شعبے بیان کیے ہیں :۔

۱۔ حکمتِ معاشیہ ۲۔ حکمتِ اکتسابیہ ۳۔ حکمتِ منزلیہ ۴۔ حکمتِ تعاملیہ اور ۵۔ حکمتِ تعاونیہ ۔

امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے قرآن کے پیش کردہ اُصولوں کی روشنی میں انسان کو اعتدال و توازن کی زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی۔ انھوں نے رفاہیت کے تین درجے بیان کیے ۔ اوّلاً رفاہیتِ بالغہ، ثانیاً رفاہیتِ ناقصہ اور ثالثاً رفاہیتِ متوسطہ۔ جب افرادِ انسانی عیش و عشرت، آرام طلبی اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنا شروع کردیتے ہیں، جب وہ اپنی خوراک، لباس، مکان اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زرِ کثیر صرف کرتے ہیں اور بے جا و نارو تصرفات سے ملک و قوم کی دولت برباد کرتے ہیں تو ایسے لوگ رفاہیت بالغہ کے درجہ میں ہوتے ہیں۔ اور جب لوگ ارتفاقِ

میں اس قدر پست ہوں کہ ان کا معیارِ زیست اور طریقِ حیات حیوانوں کی مانند ہو تو وہ لوگ 'رفاہیتِ ناقصہ' کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ افراط کی طغیانیوں اور تفریط کی تنگیوں سے اپنے دامن کو بچاکر اعتدال و توازن کی زندگی بسر کرتے ہوں وہ رفاہیتِ متوسط کے درجہ میں شمار ہوتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ تمام افرادِ انسانی کو رفاہیتِ متوسطہ کے درجہ میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اسلام کے آفاقی اور عالمگیر اُصولوں کے پیشِ نظر امام الہند شاہ ولی اللہؒ افرادِ انسانی کو حلال اور حرام اشیاء میں فرق و امتیاز برتنے پر اصرار کرتے ہیں۔ انہیں عمدہ اور سادہ غذا کھانے کی تلقین فرماتے ہیں۔ صاف ستھرے لباس، محبت کے اصولوں کے مطابق رہائش، پاکیزہ افکار اور نظافت پر زور دیتے ہیں۔ مناسب زیب و زینت اور مطلوبہ جنسی تسکین کو جائز اور قبول عام ذرائع سے حاصل کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کے دوران انسان کو خدا پر غیر متزلزل یقین اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور ان تمام ذرائع آمدنی کو حرام قرار دیتے ہیں جن سے ایک فرد دوسرے افراد کا انفرادی یا اجتماعی استحصال کرتا ہو اور جو ذرائع معاشرہ کی تخریب و تباہی کا سبب بنتے ہوں اور جن سے ارتکازِ زر ایسی معاشی لعنت جنم لیتی ہو۔

امام الہندؒ اُن تمام اشیاء کی خرید و فروخت ممنوع قرار دیتے ہیں جو معاشرہ کے اَخلاق کو برباد کرنے والی ہوں۔ اس ضمن میں ہر نوع کی نشہ آور اشیاء اور رقص و سرود سے متعلق تمام پیشے شامل ہیں — وہ ایسے تمام مُعاملات کو بھی مُسترد کرتے ہیں جو بعد ازاں نزاعات اور مقدمہ بازی کا موجب بنتے ہوں — وہ اُن تمام مُعاہدات کو غیر قانونی اور غیر موثر قرار دیتے ہیں جن میں شئے یا مال کی نوعیت، مقدار اور قیمت معین نہ ہو — بن دیکھے مال کی خرید و فروخت اور بیع در بیع کو بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں — وہ ہر قسم کی ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ اور نفع خوری کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

تعاون کو تہذیب و تمدن اور ثقافتی زندگی کی رُوح قرار دیا جاتا ہے اس لیے حصولِ زر اور ترقیٔ اموال کے وہ تمام ذرائع ناجائز اور اُصولِ تمدن کے منافی ہیں۔ جو تعاون کی رُوح سے خالی ہوں۔ بنابریں ہر نوع کی قمار بازی اور سٹہ بازی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ قمار بازی اور سٹہ سے کئی اور خطرناک معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اور ویسے بھی اس سے تن آسانی اور محنت کیے بغیر حصولِ زر کا انتہائی غلط اور گمراہ کن رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی حصولِ زر کے وہ تمام ذرائع جن میں بظاہر تو اشتراک و تعاون کی کوئی نہ کوئی شکل و صورت موجود ہوتی ہے لیکن ان کے پسِ پردہ درحقیقت ایسے عناصر وعوامل کارفرما ہوتے ہیں جو صرف اشتراک و تعاون کے خاتمہ ہی کا نہیں بلکہ پُرامن اور خوشگوار زندگی کی موت کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال سودی کاروبار ہے۔

ایک وسعت پذیر اور ترقی پسند معاشرہ میں جس امر کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ ایک دوسرے کی امداد و اعانت اور باہمی اشتراک و تعاون ہوتا ہے۔ اس ضرورت کے بطن سے حکمتِ تعاونیہ کے وہ اصول جنم لیتے ہیں جو کفالتِ مشترکہ کاروبار، زراعت و تجارت، صنعت و حرفت اور مزدور و آجر کے تعلقات و معاملات کا تعین کرتے ہیں۔ اِس طرح افرادِ انسانی زندگی کی مختلف حکمت عملیوں کی مختلف کارگزاریوں کے ذریعہ معاشرہ کی پرشکوہ اور پروقار عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ ارتفاقاتِ مَعاشیہ کے اصولوں اور حکمت عملیوں کی بدولت پُررونق اور پُرکشش شہر معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ امام الہندؒ شہر کو محض کوچہ و بازار، سنگ و خشت سے تعمیر شدہ فصیل و عمارات اور فلک بوس محلات پر مشتمل ایک ساکت و صامت آبادی تصوّر نہیں کرتے بلکہ شہر سے ان کی مراد وہ زندہ و درخشندہ اور رواں دواں معاشرہ ہوتا ہے جس میں باہمی ربط و ضبط کی کارگزاریاں، اشتراک و یگانگت کی کرشمہ سازیاں، حرکت و عمل کی گُل کاریاں، اخلاق و آداب کی رعنائیاں، تہذیب و تمدن کی رنگینیاں اور وحدت و اُخوت کی توانائیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ مختلف خاندانوں، قبیلوں اور جماعتوں کے یکجا رہائش پذیر

ہونے سے ایک ایسی وحدت معرضِ وجود میں آتی ہے جس سے شہر کی حیثیت ایک شخص کی مانند ہو جاتی ہے، جس طرح شخص کبھی تندرست و توانا اور خوش و خرّم ہوتا ہے، اور کبھی بیمار و پژمردہ اور تنگ دست ــــــ اسی طرح شہر بھی کبھی طاقتور و توانا اور خوش حال و فارغ البال ہوتا ہے اور کبھی مفلس و نادار اور ویران و تباہ حال۔ جس طرح شخص حادثات سے دوچار ہو کر زخمی ہو جاتا ہے اسی طرح شہر بھی نہ صرف حادثات سے دوچار ہوتا ہے بلکہ زخم خوردہ بھی ہو جاتا ہے۔ کبھی شہر کی رونقیں اندرونی امراض اور خلفشار کا شکار ہو جاتی ہیں اور کبھی اس کی توانائیاں بیرونی حملوں سے تباہ و برباد ہو رہ جاتی ہیں۔ جس طرح کسی شخص کی صحت و توانائی، اس کی نشو و ارتقاء اور آزادی و عزّت کے لیے ضروری ہے کہ اسے کسی مستقل رفاہی نظام کے تحت رکھا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ایک لازمی امر ہے کہ شہر کی دلکشی و صفائی، فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے کوئی مناسب و مؤثر اور مستقل معاشی نظام نافذ کیا جائے۔
امام الہندؒ کے نظریات کے مطابق ایسا رفاہی معاشی نظام صرف خدمتِ خلق، اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کے اسلامی اُصولوں پر ہی استوار کیا جا سکتا ہے۔

کسی فرد کے مال و دولت سے جب کوئی دوسرا تجارت کرتا ہے اور اس کا منافع باہم تقسیم کر لیا جاتا ہے تو اُسے "مُضَارَبَتْ" کہتے ہیں ــــ جب چند افراد یکساں مالیت کی اشیاء سے مشترکہ کاروبار کرتے ہیں اور اس کا نفع آپس میں بانٹ لیتے تو ایسی صورت میں وہ افراد ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں اور اس معاہدہ کو "مُفَاوَضَتْ" کا نام دیا جاتا ہے ــــ جب معین مال سے کاروبار میں شرکت کی جاتی ہے اور کوئی دُوسرے کا کفیل نہیں ہوتا تو ایسی صورت کو "عنان" کا عنوان دیا جاتا ہے۔
جب کسی پیشہ سے وابستہ افراد مل جُل کر مزدوری کرتے ہیں اور اُجرت تقسیم کر لیتے ہیں تو اُسے "شرکتِ صنائع" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کاروبار اور محنت کی ان چار صورتوں میں شاہ صاحب ایسی افہام و تفہیم اور معاملہ بندی کے قائل ہیں جس سے کسی نوع کے فتنہ و فساد کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

کاروباری اشتراک کی ایک شکل مُزارعت بھی ہے۔ اس میں محنت و آلاتِ کشاورزی ایک شخص فراہم کرتا ہے اور زمین کا مالک کوئی دُوسرا شخص ہوتا ہے۔ اسلامی انقلاب برپا ہونے سے پیشتر عربوں میں بھی مزارعت کا رواج عام تھا۔ لیکن دنیا کے سب سے عظیم انقلابی رہنما نے عدل و انصاف کے اسلامی اصولوں کو نافذ کرکے تاریخِ انسانی میں پہلی مرتبہ اس معاشی لعنت کا خاتمہ کردیا۔ پیغمبرِ اسلام کے بعد مزارعت کی فرسودہ رسم نے پھر سر اُٹھایا۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسے خلاف قانون قرار دے دیا۔ امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے بھی امامِ اعظمؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مزارعت کی مخالفت اور ممانعت کی۔ اور اس طرح اُنھوں نے جاگیرداری اور زمین داری ایسی فتنہ پرور معاشی استحصال کی لعنت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی بھرپور اور سرتوڑ ذہنی وفکری جدوجہد کی۔ مزارعت ایسی برائی سے نجات اور رہائی حاصل کیے بغیر نہ تو کسی طور معاشرہ کو جبر و استحصال سے پاک وصاف کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ افرادِ انسانی کو باعزت و باوقار زندگی کے اسباب ہی فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ نہ تو عوام مُعاشی مشکلات کے چنگل سے آزاد ہوکر ترقی حاصل کرسکتے ہیں اور نہ وہ مذہبی فرائض ہی کو آسانی اور سہولت سے انجام دے سکتے ہیں۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظالمانہ شکنجے میں پھنس کر ان کی زندگی منجمد ہوکر رہ جاتی ہے۔ اور وہ انسانیت کے بلند مقامات پر رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ ایک عمدہ اور ترقی پسند انقلابی اقتصادی پروگرام ہی کی بدولت اجتماع کے اخلاق وآداب صورت پذیر ہوسکتے ہیں۔ افرادِ انسانی اپنے اخلاق سنوار کر ہی اور تہذیبِ نفس کے ذریعہ اپنی ذات کی تکمیل کرنے کے بعد ہی قبر کے عذاب، حشر کے خوف، احتساب سے بچ سکتے ہیں اور اخلاق وآداب کی یہ تکمیل ہی دنیاوی اور اخروی تمام نعمتوں کی مستحق قرار دیتی ہے۔

شاہ صاحبؒ کے خیال کے مطابق معاشرہ کی تمام برائیاں خواہ وہ اخلاقی ہوں یا روحانی، تہذیبی ہوں یا ثقافتی، سیاسی ہوں یا عمرانی، ان کا اصل سبب اور بنیادی وجہ معاشی عدمِ مساوات ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس معاشرہ

میں اقتصادی توازن موجود نہ ہو اس میں طرح طرح کی خرابیاں اور برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نہ تو ایسے معاشرہ میں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب ہی مثبت کردار انجام دے کر خاطر خواہ نتائج برآمد کر سکتا ہے۔

اس ضمن میں معاشرہ کے تمام ذمہ دار افراد کو یہ حدیثِ نبوی ہر لحظہ ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے :-

"قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ دیا؟ بندہ حیران ہو کر جواب دیگا کہ اے باری تعالیٰ تُو تو بھوک سے بے نیاز ہے، تجھے کھانے کی کیا حاجت؟ پھر باری تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہ دیا، میں ننگا تھا تم نے مجھے تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ دیا۔ خداوند تعالیٰ کے ان سوالوں کے جواب میں بندہ کہے گا، اے ربّ العزت تجھے ان اشیاء کی کیا ضرورت ہے، تُو تو ان سب دنیاوی اشیاء سے بے نیاز ہے۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میرا ایک بندہ بھوکا تھا، تم نے اسے کھانا نہ کھلایا، وہ پیاسا تھا تم نے اسے پانی نہ پلایا، وہ ننگا تھا تم نے اسے لباس نہ پہنایا۔"

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ معاشرہ کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ وہ دیکھے کہ کوئی فرد بھی بھوکا نہ رہے۔ اس کے خورد و نوش، تعلیم و صحت اور رہائش و لباس کی تمام ضروریات پوری ہوں۔ اس فرض کی ادائیگی کے بعد معاشرہ پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ افرادِ انسانی کو مشینی آلات سمجھتے ہوئے ان سے یکساں نوعیت کے کام نہ لے بلکہ قابلیت، قوت، استعداد اور صلاحیت کو معیار قرار دیکر ان سے ان کے منصب و مقام کے مطابق کام لیا جائے۔ جو افراد سید بالطبع ہوں یعنی جن میں تعمیر و ترقی کے لیے محنت و جانفشانی کا مادّہ موجود ہو، جو عزم و عمل کی قوتوں کو بروئے کار لا کر پامردی اور ثابت قدمی سے اپنے انفرادی اور اجتماعی مقاصد کی تکمیل میں سرگرم عمل ہوں، ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں اور عملی قوتوں سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے۔ وہ جو بھی کارنامے انجام دیں، معاشرہ

کی فلاح وترقی اور قوم کی سربلندی کی خاطر جو بھی سعیٔ وکوشش کریں انہیں ان کی سرگرمیٔ عمل اور کاوشوں کی مناسب اور جائز داد ملنی چاہیے۔ اسی طرح جو لوگ ذہنی و فکری اعتبار سے کم استعداد کے مالک ہوں یا جسمانی اعتبار سے کمزور وناتواں ہوں اُنھیں عُضوِ معطّل قرار دے کر معاشرہ کا بے کار اور ناکارہ حصہ نہیں سمجھ لینا چاہیے بلکہ مناسب تعلیم وتربیت کے ذریعہ ان میں ایسے اوصاف پیدا کیے جانے چاہئیں کہ وہ معاشرہ پر بوجھ بننے کی بجائے ملک وقوم کے لیے کوئی نہ کوئی خدمت انجام دے سکیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کمزور اور کم استعداد رکھنے والے افراد کو بددل اور مایوس کرنے کی بجائے انہیں ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جس سے ان میں خود اعتمادی، احساسِ فرض اور محنت وترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ یہی وہ اندازِ فکر اور طرزِ عمل ہے جسے اختیار کرکے نہ صرف یہ کہ اپاہج اور معذور اور کمزور وناتواں افراد کی مناسب وموثر امداد و اعانت کی جاسکتی ہے بلکہ انہیں ایک نئی زندگی دے کر معاشرہ کے لیے کارآمد اور سودمند بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح معاشرہ میں مطلوبہ اشتراک وتعاون اور خاطرخواہ اعتدال وتوازن پیدا کرکے افرادِ انسانی کو زندگی کی سطح عام سے بلند کرکے ایک ایسی منفرد و ممتاز اور طاقتور وتوانا جماعت کی حیثیت دی جاسکتی ہے جو اپنی نظریاتی وحدت، فکری انفرادیت اور قومی تشخص کو ظاہر وثابت کرنے کی آرزومند ہو، جو انفرادی و اجتماعی قوتوں کے اظہار کا عزم، مشترک مقاصد کی تکمیل کی تمنا اور مشترکہ نصب العین کے حصول کی خواہش رکھتی ہو۔

اس طرح سے ایک ایسی جماعت کی شیرازہ بندی ہوسکتی ہے جو ہر قسم کی تعصّب وتنگ نظری اور ہر نوع کی تقسیم وتفریق سے بلند و بالا ہوکر ایک جسم، ایک جان اور ایک آواز کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ جو اپنے اشتراک واتحاد، احساسات وجذبات، اپنے اساسی افکار اور موروثی اقدار کی بدولت اور اپنی شاندار وباوقار قیادت کی بدولت عظیم ترین سیاسی کارنامے سرانجام دے سکتی ہے۔

اِعْمَلُوْا وَجَاهِدُوْا کی اس انقلابی روش پر کاربند ہوکر جس کے ذریعہ قرونِ اُولیٰ

کے مسلمانوں نے اسلام کے پیغام کو چند برس کے قلیل عرصہ میں دور دراز ممالک کے قبیلوں اور اقوام تک پہنچا دیا تھا۔ اور صرف دس برس کی مختصر مدت میں چھتیس ہزار ۳۶۰۰۰ شہر اور قلعے فتح کر کے پچیس لاکھ مربع میل پر مشتمل بیشمار ممالک کو خلافتِ اسلامیہ میں داخل و شامل کر کے کروڑوں افرادِ انسانی کو اسلام کی لازوال دولتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ امام الہندؒ نے مسلمانوں کو اس فریضہ کی بجاآوری کی دعوت دی جو خالقِ کُل نے انھیں اپنا نائب اور خلیفہ قرار دے کر انبیائے کرام کے ذریعہ ان پر عائد کیا گیا تھا۔

اس اجمالی بحث و مطالعہ کے بعد یہ دعوٰی بلاخوفِ تردید کیا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات نے اسلامیانِ برصغیر کے اندازِ فکر اور ان کے طرزِ عمل کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور ان کے پیش کردہ اقتصادی نظام نے غلام و محکوم افرادِ انسانی کے ذہن میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ یہ فکر ولی اللٰہی کی کرشمہ سازی تھی کہ ارضِ ہندوستان پر سرفروشانِ اسلام کی ایک ایسی جماعت کی شیرازہ بندی ہوئی جو خُدا کی زمین پر خُدا کے قوانین کا نفاذ چاہتی تھی۔ جو ظالموں کا سر جھکا کر مظلوموں کی دادرسی کی خواہاں تھی اور اور جو اپنے ملی مقاصد کی تکمیل میں سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ و تیار تھی۔

یہ شاہ ولی اللہؒ کی مفکرانہ نگارشات کا اثر و اعجاز تھا جس نے افرادِ انسانی کو آزادی کی عظمتوں، حریت کی برکتوں اور خودی کی رفعتوں کا گرویدہ بنا کر وحدت و اخوت کی وسعتوں سے ہمکنار کر دیا۔ یہ ان کے پیش کردہ تاریخِ ہندوستان کے اولین اقتصادی نظام کی جذب و کشش بھی جس نے کروڑوں مفلس و نادار اور بے سروسامان افراد کو ظلم و ستم اور جبر و استحصال کی طاغوتی طاقتوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ یہ ان کے عہد آفریں پیغام کا سوز و گداز تھا جس نے اسلامیانِ برصغیر کی نجات اور رہائی کے لیے برصغیر کے چند مسلم مفکروں کو جنم دیا۔ عصرِ حاضر کی تمام عظیم شخصیات نے علم و حکمت کے ان چراغوں کی روشنی کو برصغیر کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دیا جن چراغوں کو فکرِ ولی اللٰہی نے روشن کیا تھا۔

فی الحقیقت شاہ ولی اللہؒ نے تاریخ کی گزرگاہوں پر ایسے تابندہ و لازوال نقوش

چھوڑے ہیں جنہیں پاک و ہند کے اطراف واکناف میں تعلیمی درسگاہوں کی صورت کے علاوہ شہادت گاہ بالاکوٹ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے انقلاب پرور اور ایمان افروز کارناموں میں واضح اور نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں تحریکِ پاکستان بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی اس تحریک کا ناقابلِ تقسیم حصہ ہے، جس تحریک کا آغاز شاہ ولی اللہؒ نے کیا تھا۔

یہ دعویٰ بجا طور پر کیا جاسکتا ہے کہ قیام پاکستان کا اصل اور بنیادی مقصد اس اقتصادی پروگرام کو عملی جامہ پہنانا تھا جسے امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے اسلام کے عالمگیر اور آفاقی اُصولوں کے مطابق پیش کیا تھا۔

اہل جاہلیت کے نزدیک ایک یہ بھی مسلمہ اصول وعقیدہ تھا کہ "عالم بالا" میں ایک ایسا مقام موجود ہے جہاں وقتاً فوقتاً بتدریج حوادث و واقعات کا فیصلہ ہوا کرتا ہے اور کسی نہ کسی نہج اور کسی نہ کسی طریقہ پر اس مقام میں ملائکہ مقربین اور صالح بزرگ انسانوں کی دعائیں مؤثر ہوا کرتی ہیں۔ اس حد تک تو یہ عقیدہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان کے اذہان میں یہ عقیدہ اس شکل میں متمثل اور راسخ ہوگیا تھا کہ یہ لوگ بارگاہِ خداوندی میں اسی طرح شفاعت اور سفارش کیا کرتے ہیں۔ جس طرح بادشاہوں کے حضور میں ندماء وزراء اور مصاحبین کیا کرتے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۲۹ طبع شیخ غلام علی لاہور